POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 November 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 02-11-2026 • Price: 5/- • 8-14 November 2026 • Issue: 42 • Vol:85

۸تا۱۴؍نومبر ۲۰۲۶ء • شمارہ:۴۲ • جلد:۸۵

’بچوں کا ادب‘ منظر و پس منظر

عارف عزیز

بچّوں کے ادب سے مراد وہ تخلیقات ہیں جو بچوں کے ذہن و فکر کو پیشِ نظر رکھ کر آسان و سلیس زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ یہ ادب نہ صرف بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے بلکہ اُنھیں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور عمل کرنے کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔

اُردو زبان میں بچوں کے ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں، 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ بچوں کے ادب پر توجہ دی گئی، اِس سے پہلے کی ایک صدی کے دوران اُردو زبان میں بچوں کے ادب کا سراغ نہیں ملتا، اِس تاخیر کی وجوہ اہلِ قلم کو ادبِ اطفال کی اہمیت کا احساس نہ ہونے، بڑوں کے ادب کی تخلیق میں منہمک رہنے یا اِس موضوع پر قلم اُٹھانے والوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہ کرنے میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کا حال یہ ہے کہ عوام الناس تو کیا لکھنے پڑھنے والوں کو بھی معلوم نہیں کہ ’بچوں کی کتابوں کا عالمی دن‘ 2 اپریل 1967 سے دنیا میں منایا جارہا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں سے دریافت کیا جائے کہ اُنھوں نے بچوں کے ادب کے لیے کچھ لکھا ہے تو بڑی تعداد کا جواب نفی میں ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا، بڑوں کے لیے لکھنے سے زیادہ پیچیدہ عمل ہے، لیکن اُردو کے مشاہیر اہلِ قلم نے اِس کی اہمیت کو سمجھا تھا، تبھی مرزا غالبؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ اور ڈپٹی نذیر احمد نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے قلم اُٹھایا۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ، نظیرؔ اکبر آبادی نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں، جن میں پند و نصائح کے طور پر بہادری و بلند کرداری اور اتفاق و اتحاد کی تلقین کی گئی تھی، جہاں تک بچوں کے لیے مستقل لکھنے کا سوال ہے تو مولوی اسماعیل میرٹھی پہلا نام ہے، جنھوں نے بچوں کے لیے خوب لکھا اور اُن کی نظمیں بچوں میں مقبول ہوئیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ خود کو طلبہ کی نصابی کتب مرتب کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ مولانا حالیؔ، علامہ شبلیؔ اور ڈاکٹر اقبالؔ کا شمار قوم کے مصلحوں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے انسانیت کی فلاح و بہبود کا اہم کام لیا، لہٰذا فطری طور پر اُن کی توجہ بچوں کے اخلاق سدھارنے کے لیے کارآمد ادب تخلیق کرنے کی طرف مبذول ہوئی۔

اکیسویں صدی کے آغاز تک اُردو زبان میں بچوں کا ادب تین صدیوں کو محیط ہوگیا ہے، کیوں کہ انیسویں صدی کے آخر میں اِس کی ابتدا ہوئی، بیسویں صدی میں اِس کا فروغ ہوا اور آج اکیسویں صدی میں اِس کا تسلسل جاری ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے معیار کا ’ادبِ اطفال‘ ہمارے یہاں تخلیق نہیں ہوسکا۔ پچھلی صدی میں تعلیم کے فروغ ہونے سے یہ ضرور ہوا کہ تعلیم گھروں اور مدرسوں سے سرکاری اسکولوں میں منتقل ہوگئی، اخبارات و رسائل پڑھنے پر عوام کے ساتھ نئی نسل کا رُجحان بڑھا تو بچوں کے لیے بڑے ادیبوں نے بھی لکھنا شروع کردیا۔ امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کا کردار اور ڈرامے، حفیظ جالندھری کی عمرو عیار، خواجہ حسن نظامی کے انشائیے، پریم چند کی کہانیاں، کرشن چندر کے ناول اِسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بیسویں صدی میں بچوں کے لیے جن اہلِ قلم نے لکھا، اُن کی فہرست طویل ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، محوی صدیقی، حامد اللہ افسر، صالحہ عابد حسین، احمد ندیم قاسمی، عادل رشید، سراج انور، امین حزیں، فراغ روہوی اور وکیل نجیب چند نام ہیں، جنھوں نے بچوں کے لیے شعری و نثری محفل آراستہ کی۔ بچوں کے رسائل کے لیے قلم اُٹھانے والے شعرا میں حفیظ جالندھری، تلوک چند محرومؔ، راجہ مہدی علی خاں، شفیع الدین نیر، ظفر گورکھپوری، مظفر حنفی، محبوب راہی، حافظ شکارپوری، متین نیاز، انجم مظفر پوری شامل ہیں، جب کہ خواتین قلم کاروں میں لیلیٰ خواجہ بانو، حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، اے آر خاتون، عفت موہانی، شفیقہ فرحت، عطیہ حزیں، کشور ناہید، بانو سرتاجؔ، رضیہ سجاد ظہیر، مسعودہ حیات، رفیعہ منظور الامین، جیلانی بانو اور صادقہ نواب سحرؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک بچوں کے رسائل کے اجرا کا سوال ہے تو آزادی سے قبل چند رسائل بچوں کے لیے نکالے گئے۔ ’اتالیق‘ 1908 میں حیدر آباد سے منظرِ عام پر آنے والا پہلا رسالہ ہے، بعد میں ’ادیب الاطفال‘، ’المعلّم‘، ’نونہال‘ جاری ہوئے، حیدر آباد کے کئی اُردو روزنامو ں نے بچوں کے لیے صفحات مخصوص کرکے اور اُن کی انجمنیں بنا کر بڑی مقبولیت حاصل کی۔

ملک کے دوسرے اُردو اخبارات نے بھی اِس روایت کو آگے بڑھایا۔ آزادی کے بعد بچوں کے جن رسائل نے پورے ملک میں دھوم مچادی اُن میں دہلی کے ’کھلونا‘ اور ’پیامِ تعلیم‘ سرِ فہرست ہیں، ان کے علاوہ ’نور‘، ’غنچہ‘، ’ہلال‘، ’اچھا ساتھی‘ وغیرہ بچوں کے درجنوں رسائل مختلف شہروں سے شائع ہوکر نئی نسل کی تربیت کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔

حالاں کہ بچوں کے ادب کی تخلیق آسان کام نہیں، اِسے بخوبی انجام دینے کے لیے بچوں کی فطرت کا راز داں بن کر تخلیقات کو موضوع و اسلوب سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری اور بھی زیادہ دشوار ہے، یہ وہی شاعر کرسکتا ہے جو بچوں کے ساتھ بچہ بن کر سہلِ ممتنع کی شاعری کرے۔ اُس کے پاس علم کا جو خزانہ ہے، اُسے بچوں کے ذہن میں یوں منتقل کردے کہ بچہ کھیل سمجھ کر اُسے قبول کرلے، یہ اُس کے ذہن پر بوجھ نہ بنے۔ ہر بچے کی ذہنی سطح اُس کے ماحول و تربیت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے۔ برطانیہ کا بچہ صبح ہوتے ہی اخبار سے کھیلتا ہے لہٰذا اُس ملک کی ڈپلومیسی مشہور ہے۔ جاپان کا بچہ صبح آنکھ کھولتے ہی کھلونے کی طرف دوڑتا ہے اِس لیے کہ وہاں کے کھلونے اور مشینیں شہرت رکھتی ہیں۔ ہماری تیسری دنیا کے بچے روٹی کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں کیوں کہ یہاں بھوک و افلاس حاوی ہے۔ بچوں کا معیاری ادب ایسے سبھی قسم کے بچوں کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں معین و مددگار بن سکتا ہے۔ معیاری ادب کا مطلب اُس کی ادق زبان یا بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ اِس سے مراد وہ ادب ہے، جسے بچہ دل و دماغ میں جذب کرلے اور اُس کے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے میں مددگار بنے۔ اِس عمر میں عقل تو کچی ہوتی ہے لیکن تخیل تیز ہوتا ہے۔

یاد رکھیے! معاشرے کی تعمیر و تشکیل کا دارومدار اِس پر بھی ہے کہ اُس کے بچے کس طرح کے خواب دیکھتے ہیں، کن باتوں کے بارے میں سوچتے اور کیا بننا چاہتے ہیں، نامعلوم کا تجسس اور معلومات کی مسرت مل کر ہی اُن ذہنوں کی تشکیل کرتی ہے، جن سے خواب دیکھنے والے فن کار اور اُن خوابوں کو عملی شکل میں ڈھالنے والے دانشور و سائنس داں پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے غور و فکر کا پہلو یہ ہے کہ ہم بچوں کو کیا بنا رہے ہیں۔ یہ سوال معاشرے، اسکول اور گھر تینوں سے وابستہ ہے۔

قارئین! اب ’ہماری زبان‘ کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

آج کی دنیا سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ سے کافی سمٹ گئی ہے۔انسان ایک دوسرے سے قریب آ گئے ہیں، لیکن ایجادات واختراعات کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اُن بنیادوں کو نظرانداز کردے جو ایجادات و تحقیقات کی وجہ ہیں۔ ہر ایجاد کے پیچھے جو شے کارفرما ہوتی ہے، وہ انسانی فکروذہن کی روشنی ہے اور اِس انسانی ذہن کو تابناک بنانے کا ذریعہ علم ہے، جو کتابوں تک محدود نہیں لیکن علم کی ترقی میں کتابوں کا حصّہ سب سے زیادہ ہے۔ کتابیں صرف اوراق کا مجموعہ نہیں بلکہ علم کے وسیع سمندر سے اُس کی مثال دی جاسکتی ہے۔ آنے والی نسلیں اِس سمندر سے پیاس بجھا کر اپنی منزل تک پہنچتی ہیں جو دنیا میں اُن کی سرخ روئی کا باعث بنتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں کتابوں سے دلچسپی تشویشناک حد تک کم ہورہی ہے، اِس کے لیے صرف نئی نسل کو ذمے دار قرار دینا زیادتی ہوگی کیوں کہ اِس کمی وکوتاہی کے لیے گھر، اسکول اور معاشرہ مساوی طور پر ذمے دار ہیں۔ اِس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہے کہ اِس رجحان کی سنگینی کو نہ تو سمجھنے کی کوشش ہوئی، نہ بدلنے کے لیے قدم بڑھائے گئے، کتب بینی کے کم ہوتے اِس رویے کے لیے عام طور پر ٹیکنالوجی کی ترقی کو ذمے دار قرار دیا جاتا ہے، لیکن انٹرنیٹ ہو یا کمپیوٹر یہ ہرگز تقاضا نہیں کرتے کہ اُن کے لیے چوبیس گھنٹے فارغ کردیے جائیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج گھر کے بڑوں نے بچوں کی تربیت بالخصوص اُن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا چھوڑ دیا ہے، کم ہی گھرانے ایسے ہوں گے جہاں بچے بڑوں کی نظر میں رہ کر غیر صحت مند سرگرمیوں سے دور رہتے ہوں، اِس کی ایک وجہ ہمارے یہاں کے مشترکہ خاندانی نظام کا کمزور ہونا ہے۔ اِس نظام کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ماں باپ ہی نہیں۔ دوسرے رشتے دار بھی دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، پھوپھی سب بچوں کی سرگرمیوں، عادات واطوار سے واقف ہوتے تھے اور اُن کی غلطیوں پر ٹوک دینا اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ اِس نظام میں رہتے ہوئے بچے اپنی ثقافت وتہذیب سے بھی آگاہ ہوتے تھے، پڑھنے لکھنے کے لیے وقت فارغ کرتے تھے، اُن کی تعلیم کا آغاز عموماً گھر کے بڑوں سے ہوتا تھا، جس میں رات کو کہانیاں سنانا شامل تھا۔ اِن کہانیوں میں حیرت، سبق، تاریخی واقعات، بہادری کے قصے اور نصیحتیں ہوتی تھیں اور یہ بچوں کی ذہنی تربیت میں معاون بنتی تھیں۔ چھوٹی عمر میں کہانیاں سننے کی یہ روش نوجوان ذہنوں کو کہانیاں پڑھنے اور لکھنے پر اُبھارتی تھی۔ محنت و شوق سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے تھے، اِس نظام میں معلومات کے تبادلے کے لیے مواقع بھی زیادہ تھے۔ والدین نہیں تو خاندان کے دوسرے بزرگوں سے گفتگو کرکے نوجوان اپنی ادھوری معلومات مکمل کرلیتے تھے۔

آج کے عہد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بچوں کی مادری زبان میں تعلیم ہو، اِس کی فکر سرپرستوں کو نہیں، اِس لیے بچوں کو نہ اُردو کی کہانیوں سے دلچسپی ہے، نہ نظموں سے۔ پچیس تیس سال قبل تک جن کہانیوں، کتابوں اور رسالوں کے بچّے عاشق تھے۔ آج کے بچے اُن کا نام بھی زبان پر نہیں لاتے۔ یک گونہ تسلی کی بات یہ ہے کہ مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک، بہار ریاستوں میں بچے اُردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں، لہٰذا اُنھیں ہر ماہ بچوں کے رسائل کا انتظار رہتا ہے۔ وہ اُردو میں کہانیاں اور نظمیں شوق سے پڑھتے ہیں، اِس لیے موجودہ عہد کا بنیادی کام سرپرستوں اور بچوں میں اُردو پڑھنے، پڑھانے کا مزاج بنانا ہے، اِس کے بعد بچوں کے ادب پر توجہ نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ یہ ادب بھی بچوں کا ہم مزاج ہو، غیر فطری و جذباتی نہ ہو، ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جائے جو عہدِ حاضر کی زندگی سے وابستہ ہوں۔ علم ومعلومات میں اضافے کا باعث بنیں، بچوں کو عزم وہمت کے ساتھ انسانیت کا سبق پڑھائیں، بچوں کی نفسیات وکیفیات کو پیشِ نظر رکھ کر جو ادب لکھا جائے گا، وہی بامقصد اور ثمرآور ہوگا۔

20-گھاٹی بھڑبھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

چوتھی اور آخری قسط

شبلی کی تحریکی حسیت اور اس کے اسباب ومحرکات

محمد الیاس الاعظمی

(گذشتہ سے پیوستہ)

14- مکہ یونیورسٹی کی تجویز اور مدینہ یونیورسٹی کا نصاب

علامہ شبلی نے نہ صرف ہندستان بلکہ عالم اسلام کی تعلیمی زبوں حالی پر غور وفکر کے بعد حرم محترم مکہ معظّمہ میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں ایک مفصل مراسلہ اخبارات میں شائع کرایا، وہ مراسلہ درج ذیل ہے:

''واقعات حال نے ایک ایک شخص کو آنکھوں سے دکھادیا کہ اسلام (یعنی مسلمان) آفتاب لب بام ہورہا ہے، اور اگر عام مسلمان اپنی تمام قوت ایک اجتماعی صورت میں صرف نہ کریں گے تو اب ان کی بقا کی امید نہیں۔ یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ تدبیر میں اختلاف ہے اور کوئی خاص مشترک رائے نہیں قائم ہوتی۔

میرے نزدیک سب سے مقدم تجویز یہ ہے کہ مکہ معظّمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جن میں علوم جدیدہ بھی شامل ہیں) علوم کی اعلا درجے کی تعلیم ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ آج کل ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے اور دراصل علم ہی اصلی طاقت ہے۔ اس لیے آج کل ہر قوم کی بقا اسی پر موقوف ہے کہ وہ تمام علوم وفنون میں کامل ہو۔

مکہ معظّمہ میں جامعہ اسلامیہ کے قائم کرنے کی ترجیح کی متعدد وجوہ ہیں:

1- مکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز ہے اور ہر ملک کے مسلمان بہ شوق ورغبت وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاسکتے ہیں، مصر یا قسطنطنیہ یا کسی اور مقام میں یہ کوشش نہیں ہوسکتی۔

2- جس قدر سرمایہ کثیر مکہ معظّمہ کی جامعہ کے لیے فراہم ہوسکتا ہے اور کسی مقام کے لیے نہیں ہوسکتا۔

3- ہر سال حجاج سے اگر صرف دس روپے فی کس وصول ہو تو لاکھوں کی رقم وصول ہوسکتی ہے۔

4- مکہ معظّمہ میں نہایت عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔

5- مکہ معظّمہ سے قریب طائف نہایت سرد اور خوشگوار مقام ہے اور گرمیوں کے زمانے میں طلبہ اور اساتذہ وہاں قیام کرسکتے ہیں۔

6- بڑا مقصد اس تجویز سے یہ حاصل ہوگا کہ عرب کے تمام قبائل جو ہزاروں برس سے اب تک جاہل رہتے آئے ہیں ان میں تعلیم پھیلے گی اور اس غرض کے لیے مختلف بڑے بڑے قبائل میں جامعہ اسلامیہ کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اعراب اور بدوؤں کو وظائف کے ذریعے سے علم کی ترغیب بہ آسانی ہوسکتی ہے۔

اس کام میں کسی قدر دقت یہ ہے کہ ترکی کی گورنمنٹ مشکل سے اس کی اجازت دے گی کیوں کہ ترکوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ عربوں میں علم وتہذیب پھیلنے پائے، چناں چہ بڑے بڑے صدر مقامات عرب میں ایک بھی بڑا سرکاری مدرسہ نہیں، لیکن اب ترکوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہندستان کے مسلمانوں نے ترکوں پر اپنی جاں نثاری کے اتنے حقوق قائم کردیے ہیں کہ اگر تمام مسلمان متفقاً اس قسم کی درخواست ترکی سے کریں تو وہ انکار نہ کرسکے گا۔

یہ بھی ضرور ہے کہ اس تجویز کو کسی قسم کا پولیٹکل رنگ نہ دیا جائے۔ یہ صرف ایک علمی تجویز ہے اور یوں تو آج کل ایک ایک بات یہاں تک کہ آب وہوا بھی پولیٹکل بن گئی ہے، اس کا کہاں تک لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ تجویز پسند کے قابل ہو تو سب سے پہلے اسلامی اخباروں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ تمام قوم کو اس کی طرف متوجہ کریں اور پھر بالخصوص قومی درد والوں مثلاً آغا خاں صاحب، راجہ علی محمد خاں صاحب، نواب صاحب ڈھاکہ، قزلباش خاں، نواب وقار الملک، آفتاب احمد خاں، مسٹر محمد علی، ایڈیٹر صاحب الہلال (ابوالکلام آزاد) سے استدعا کرتا ہوں کہ یہ کام آپ سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ ممکن الحصول ہے۔ میں بہ ایں ضعف اور شکستہ پائی یہ کرسکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے تمام ہندستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کرکے مکہ معظّمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔''

(ماہنامہ معارف نومبر 2013، ص85-384
روزنامہ 'زمیندار' 15اپریل 1913)

یہ مراسلہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار لاہور میں شائع ہوا، اس میں انھوں نے جیسا کہ مراسلے میں مذکور ہے مکہ مکرمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ اس مراسلے کا ذکر 'حیاتِ شبلی' میں نہیں ہے، حال ہی میں یہ دریافت ہوا ہے اور ماہنامہ 'معارف' میں شائع ہوا ہے، اس مراسلے پر اخبارات میں بحث ومباحثہ بھی ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تائید کی اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کو اس کا مرکز بنانے کی تجویز پیش کی۔

اسی زمانے میں خلافت عثمانیہ نے مدینہ منورہ میں جامعہ مدینہ کی تجویز منظور کی، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا اس میں بڑا اہم رول تھا بلکہ وہ لوگ محرک اول تھے۔ ان ہندستانی علما کی سعی وکوشش کے علاوہ اس کے نصاب کی تدوین وترتیب کے لیے علامہ شبلی، علامہ حمید الدین فراہی اور علامہ سر محمد اقبال کا نام تجویز ہوا۔ پھر علامہ شبلی نے

بزرگان قوم کے نام ایک اور مراسلہ لکھا، جو درج ذیل ہے:

''بخدمت بزرگانِ قوم!

آپ صاحبوں نے اخباروں میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مدینہ منورہ میں ترکی گورنمنٹ جو جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی اسلامی) بنانا چاہتی ہے، اس کے متعلق ہم تینوں شخصوں سے بذریعۂ تار کے قسطنطنیہ سے پروگرام نصاب تعلیم مانگا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک نہایت اہم کام ہے اور اس کے لیے ضرور تھا کہ ہندستان کے نہایت قابل علما اور تعلیم یافتگان جدید کسی موقعے پر جمع ہوتے اور پہلے سے یادداشتیں تیار کر کے لاتے اور پھر باہمی مشورے اور گفتگو سے ایک مکمل پروگرام تیار ہو کے وہاں بھیجا جاتا، لیکن چوں کہ بظاہر اس وقت اس کی امید نہیں معلوم ہوتی کہ ایسا مجمع جمع ہو سکے، اس لیے میں حضرات علما اور تعلیم یافتگانِ جدید سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے جامعہ کے متعلق جو اصولی باتیں ان کے خیال میں آئیں بذریعۂ اخبار زمیندار یا دیگر اخبارات کے شائع فرمائیں اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو پرائیویٹ طور پر بذریعۂ ذاتی خطوط کے مجھے مطلع فرمائیں۔ دیگر اخبارات سے امید ہے کہ وہ اس خط کو شائع فرمائیں۔''

شبلی نعمانی

18 مئی 1913

نیو ناگپاڑہ، بھائی کلہ، اکبر بلڈنگ نمبر 2 بمبئی

(ماہنامہ معارف، دسمبر 2013، ص 70-469

روزنامہ زمیندار 22 مئی 1913)

شیخ عبدالعزیز شاویش اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ترکی حکومت، وائس چانسلر اور دیگر ارکان نے کام شروع کیا، حتیٰ کے تعمیرات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا مگر پہلی عالمی جنگ نے ان تمام تجویزوں اور تحریکوں پر پانی پھیر دیا اور جس جامعہ میں وہ جاروب کشی کے لیے تیار تھے اس کا خاتمہ ہو گیا۔

15- تحریک دارالمصنّفین

11 فرور 1914 کو علامہ شبلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کلکتہ میں دارالمصنّفین کی تجویز قوم کے سامنے پیش کی، اسے وہ اپنا آخری میدانِ عمل اور زمرہ مصنّفین کی دائمی خدمت خیال کرتے تھے۔

(مکاتیب شبلی جلد دوم، ص: 193)

دارالمصنّفین کا بنیادی مقصد اعلا مصنّفین، مترجمین اور اہلِ قلم کی جماعت تیار کرنا، نیز بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کے طبع و اشاعت کا انتظام کرنا تھا اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جو ہر طرح سے یکسو ہو کر خالص علم و تحقیق میں منہمک رہے۔

(تعارف دارالمصنّفین مطبوعہ دارالمصنّفین، ص: 7)

بلاشائبہ مبالغہ یہ ادارہ ایک صدی سے زائد عرصے سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے، تقریباً ڈھائی سو بلند پایہ اور معرکہ آرا کتابیں اپنے مصنّفین سے لکھوا کر یا ترجمہ کرا کے شائع کر چکا ہے، اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج قومی سرمایے میں سب سے قیمتی علمی ذخیرے کا اضافہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے کیا ہے اور سب سے زیادہ اہلِ قلم اور مصنّفین اسی ادارے کے زیرِ اثر پیدا ہوئے، بلاشبہ یہ سب علامہ شبلی کا فیضان ہے۔

دارالمصنّفین نے سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، تبع تابعین، تاریخِ اسلام، تاریخِ ہند، شعر و ادب، سوانح، مکاتیب، سفرنامے، غرض مختلف النوع موضوعات پر گراں قدر کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارے نے حتی المقدور زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ ہو کر نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں پر علمی کام کیا، مالی وسائل کی کمی، مناسب افراد کی نایابی کے باوجود اس ادارے نے جو علمی ذخیرہ قوم کے سامنے پیش کیا اس کی مثال شاید ہی مل سکے، تاہم بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو وہ انجام نہ دے سکا، مثلاً سیرۃ النبیؐ پر مولانا سیّد سلیمان ندوی کے بعد کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا، تاریخ اسلام کی چار جلدوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا، تاریخ اندلس حصہ اول کے بعد بقیہ حصوں میں دوم، سوم ہی شائع ہو سکے، تاریخِ ہند پر کوئی مبسوط اور مدلل کتاب بھی نہ لکھی جا سکی، شبلی کے سلسلۂ نامورانِ اسلام کا ایک حصہ بھی سپردِ قلم نہ ہو سکا۔ نامورانِ اسلام اور حکمائے اسلام پر جس قدر کام ہونا چاہیے تھا وہ بھی نہ ہو سکا، ایسا محض مالی دشواریوں، اہلِ علم اور ارباب دولت کی بے توجہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دارالمصنّفین جو علم و فن اور تحقیق و تدقیق کا مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا، قوم کی بدمذاقی کی وجہ سے اپنے عزائم کی تکمیل شایان شان نہ کر سکا۔ قومی ترقی کا سارا دارومدار علمی، دماغی اور ذہنی ترقی پر منحصر ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نے اسی کام کے لیے یہ ادارہ قائم کیا تھا مگر قوم کے صاحب ثروت افراد اس ادارہ حکمت و دانش کو خاطر خواہ ترقی دینے میں مانع رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آج بھی براہیم سا ایماں پیدا ہو جائے تو دارالمصنّفین انداز گلستاں پیدا کر سکتا ہے۔

16- تحریک سیرت نبویؐ

نامورانِ اسلام کی سوانح لکھنے کے دوران علامہ شبلی کو بارہا خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہئے، جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا، چناں چہ انھوں نے سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کی ایک عظیم الشان تجویز قوم کے سامنے رکھی۔

(مقالاتِ شبلی ج 8، ص: 32)

اور قوم نے اس کی بڑی پذیرائی بھی کی، علامہ شبلی نے اس عزم کے ساتھ سیرتِ نبوی کی تالیف کا آغاز کیا کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔ (مکاتیب شبلی ج 1، ص: 242)

علامہ شبلی کے اس جذبۂ اخلاص نے واقعی ایک ایسی سیرت قلم بند کرا دی جو آج تک اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی۔

(ماہنامہ معارف، سلیمان نمبر ص: 178)

علامہ شبلی سیرت کی ابھی دو ہی جلدیں لکھ سکے تھے کہ ان کا وقت موعود آ پہنچا، بقیہ جلدیں ان کے شاگردِ رشید مولانا سیّد سلیمان ندوی نے لکھیں اور انھوں نے سیرتِ نبوی کا دائرہ بہت وسیع کر دیا جو سات جلدوں پر اختتام کو پہنچا۔

علامہ شبلی نے سیرت کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ایک جلد (پنجم) میں مستشرقین کے اعتراضات اور ناروا الزامات کا رد و ابطال کرنا تھا، وہ سپردِ قلم نہ ہو سکا۔ سیرۃ النبیؐ میں اگرچہ جابجا مورخینِ یورپ کے اعتراضات کی تردید کی گئی ہے تاہم علامہ شبلی کے اس خیال کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس جلد کو اصول شبلی کے مطابق قلم بند کیا جائے۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی کی زندگی میں اس کا کسی کو خیال نہیں آیا، البتہ ان کی وفات کے بعد دارالمصنّفین کے ایک اہل قلم کارکن ابوعلی اثری مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس اہم کام کے لیے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا نام پیش کیا۔ (ماہنامہ الرشاد، مئی 1983، ص: 49) مگر اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ مستشرقین کی تردید کی کوشش سے آپ ان کی اہمیت بڑھاتے ہیں اور سرفرازی کرتے ہیں، وہ اس کے مستحق نہیں، ان کے لغو اعتراضوں سے اعتنا نہ کرنا ہی بہتر جواب ہے۔ (ایضاً جون جولائی، 1983) اس لیے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہ کر سکے، غالباً شبلی کے اس نقطۂ نظر کے مطابق سیرۃ النبیؐ پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی کی وفات کے بعد سیرت النبی جلد ہفتم کی تکمیل کے لیے ان کے خلف الرشید ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی نے استاذی مولانا مجیب اللہ ندوی کا انتخاب کیا، چناں چہ انھوں نے نہایت حزم و احتیاط سے تکملہ لکھا مگر وہ اب تک سیرتِ نبوی کی مجلدات کے ساتھ شائع نہیں ہو سکا ہے۔

علامہ شبلی کے منصوبہ سیرت کی پانچویں جلد گو نہ لکھی جا سکی، تاہم مستشرقین کے لغو اعتراضات و الزامات کی بیخ کنی ان کے تلامذہ کا خاص مطمحِ نظر رہا اور وہ اپنی کتابوں اور مقالات میں یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس سلسلے کا ان کا عظیم الشان کارنامہ وہ سمینار ہے جو اسلام اور مستشرقین (Islam and oriantalist) کے عنوان سے فروری 1982 میں منعقد ہوا، جس میں دنیا بھر کے اہلِ قلم اور دانشوروں نے شرکت کی اور اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالات پیش کیے، جسے دارالمصنّفین نے 'اسلام اور مستشرقین' کے عنوان سے سات ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے اور جو اپنے موضوع پر سب سے وقیع کام ہے، اس میں مستشرقین کے بیشتر لغو اعتراضات کا جائزہ آ گیا ہے، بلاشبہ یہ علامہ شبلی کی بنیادی فکر پر عمل کا نتیجہ ہے۔

علامہ شبلی نے اپنے عہد میں مورخین اور مستشرقین یورپ کے افکار و خیالات سے آگاہی حاصل کی اور ان کے رد و ابطال میں قلم اٹھایا، لیکن ان کے بعد یہ کام منظم انداز میں نہ ہو سکا اور آج تو شاید ہی کوئی اہلِ قلم ہو جو یورپ کے موجودہ علمی و تحقیقی کارناموں سے پورے طور پر واقفیت رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ ہمارے علمی کاموں پر یورپ کے اعتراضات کیا کیا ہیں، حالاں کہ علامہ شبلی کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ یورپ کے الزامات کا تار و پود بکھیر دیا جائے اور ان پر اسلام کی عظمت واضح کر دی جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک دائمی فکر تھی، اس کا دائرہ عہد شبلی تک محدود نہ تھا۔

تحریکِ سیرت پر ڈاکٹر حافظ محمد نعیم نے مفصل مقالہ لکھا ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

''برِّصغیر میں اردو سیرت نگاری میں جو مقام اور مرتبہ مولانا شبلی نعمانی (1857-1914) کو حاصل ہے اس میں کوئی ان کا ثانی نہیں، برِّصغیر میں سیرت نگاری کی تاریخ مولانا کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، عالم عرب اور عربی زبان میں نبی کریمؐ کی سیرت مبارکہ پر سب سے زیادہ لکھا گیا لیکن برِّصغیر کی اردو سیرت نگاری اپنے بہت سے پہلوؤں اور مختلف جہات کی بنا پر عربی سیرت نگاری پر بھی فوقیت رکھتی ہے، اور اس اعزاز کا سہرا بلاشبہ مولانا شبلی نعمانی کے سر باندھا گیا ہے، مولانا شبلی نعمانی نے برِّصغیر میں سیرت نگاری کا ایسا رجحان متعارف کرایا کہ مابعد سیرت نگاری اس رجحان سے پوری طرح متاثر نظر آتی ہے۔'' (تحریکات سیرت، ص: 86)

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی تاحیات ملت کے لیے متحرک اور جدوجہد کرتے رہے، دراصل ان کا مزاج اور فکر و عمل تحریکی تھا، اس کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جہاں رہے علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا چراغ روشن رکھا۔

شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس،
اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com, Mob. 9838573645

اُردو زبان وادب کا پہلا محقق و مدرس
جان بارتھ وِک گل کرسٹ
تالیف و ترجمہ
صدیق الرحمٰن قدوائی
قیمت: 250 روپے

اردو دُنیا

صحافیوں کو کیش لیس ہیلتھ کارڈز جاری کرنے کا مطالبہ

نارائن پیٹ (4اکتوبر)۔عوامی مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعے حکومت اور سماج کے سامنے اجاگر کرنے والے صحافیوں کی صحت اور طبی تحفظ کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتے ہوئے نارائن پیٹ سنٹر پر صحافیوں نے پوسٹ کارڈ تحریک چلائی۔صحافیوں نے مطالبہ کیا کہ سرکاری ملازمین کی طرز پر تمام ورکنگ جرنلسٹس کو سرکاری و خانگی اسپتالوں میں کیش لیس طبی خدمات کی سہولت فراہم کرنے والے ہیلتھ کارڈز جاری کیے جائیں۔ریاستی صدر وتلنگانہ میڈیا اکیڈمی وسابق چیئرمین الم نارائنا اور ریاستی جنرل سکریٹری ماروتی ساگر کی اپیل پر دو اکتوبر کے روز نارائن پیٹ ضلع سنٹر کے علاوہ مختلف جگہوں پر لوگوں نے پوسٹ کارڈ احتجاج میں حصہ لیا۔ضلع سنٹر پر صحافیوں نے میونسپل پارک سے ریلی نکالی اور صحافیوں کو ہیلتھ کارڈز فراہم کرنے کے مطالبے پر نعرے لگاتے ہوئے مہاتما گاندھی کے مجسمے کو گاندھی جینتی پر پھول مالا چڑھاتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ بعد ازاں صحافی ریلی کے ذریعے پوسٹ آفس پہنچے اور تلنگانہ کے چیف منسٹر اینومولا ریونت ریڈی کے نام پوسٹ کارڈ روانہ کیے۔ پوسٹ کارڈز میں مطالبہ کیا گیا کہ صحافیوں کو کیش لیس ہیلتھ کارڈز جاری کرتے ہوئے ریاست کے تمام سرکاری و خانگی اسپتالوں میں طبی سہولت فراہم کی جائے۔اس موقعے پر صحافیوں نے کہا کہ صحافی کی صحت صرف ایک فرد کی صحت نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کی سلامتی اور مستقبل سے وابستہ ہے۔اچانک بیماری یا ہنگامی صورتِ حال میں مالی دشواریوں کے باعث صحافیوں اور ان کے افرادِ خانہ کو علاج سے محروم ہونے کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔حکومت کو صحافیوں کے لیے جامع طبی تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔انھوں نے صحافیوں کے قانونی مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ ان کی فلاح و بہبود اور تحفظ کے لیے موثر اقدام کرنے کا بھی مطالبہ کیا۔صحافیوں نے انتباہ دیا کہ اگر مطالبات کی تکمیل کے لیے موثر اقدام نہیں کیے گئے تو احتجاجی تحریک کو مزید وسیع کیا جائے گا۔ (رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

حضرت نظام الدین اولیا نے روحانیت، انسانی خدمت، امن اور ہمدردی کا پیغام عام کیا: ڈاکٹر ایس. فاروق

نئی دہلی (یکم اکتوبر)۔نئی دہلی کے بستی حضرت نظام الدین میں واقع خواجہ ہال میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا 723واں سالانہ عرس اور فخرِ دہلی حضرت خواجہ سیّد حسن ثانی نظامی کا 12واں سالانہ عرس منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز صبح گیارہ بجے حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں فاتحہ اور قوالی سے ہوا، اس کے بعد لنگر کا اہتمام کیا گیا اور حضرت خواجہ سیّد حسن ثانی نظامی کی عرس تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر 'حضرت خواجہ سیّد نظام الدین اولیا: ان کی زندگی اور خدمات' کے موضوع پر قومی سمینار اور کتاب کی رسمِ رونمائی کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ ڈاکٹر ایس. فاروق اور حامد احمد نے پروگرام میں بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ دیگر مہمانانِ اعزازی میں حافظ محمد فیاض موسم نظامی، افضل خاں، حافظ ظفر خاں اور حافظ محمد ارشد خاں شامل تھے۔ ڈاکٹر ایس. فاروق نے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا نے روحانیت، انسانی خدمت، امن اور ہمدردی کا پیغام عام کیا۔سمینار میں متعدد علما، صوفیا، مصنّفین اور ادبی شخصیات نے بھی شرکت کی۔ان میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر ایس. ایم. عزیز الدین حسین، فاروق ارگلی، ڈاکٹر عقیل احمد، حضرت پیر پاشا قادری نظامی، پروفیسر فخر الدین نظامی، خالد نظامی، ڈاکٹر عبد المالک نظامی، حافظ ہارون نظامی اور افضل منگلوری نمایاں طور پر شامل تھے۔ پروگرام میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی تحریر کردہ کتاب 'گیارہویں نامہ' کی رونمائی بھی کی گئی۔اس موقعے پر صوفیوں، ادیبوں، قومی رہنماؤں، علما اور شعرا نے شرکت کی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زندگی، تعلیمات اور خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کا انعقاد خواجہ سیّد محمد شافی نظامی (سجادہ نشیں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی) کی جانب سے کیا گیا تھا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

'اردو والے پریم چند، ہندی والے پریم چند' کے عنوان پر ادبی مذاکرہ

آگرہ (9اکتوبر)۔معروف افسانہ نگار منشی پریم چند کی برسی کے موقعے پر ہوٹل گرینڈ میں 'اسمرن پریم چند-26' پروگرام کے تحت 'اردو والے پریم چند، ہندی والے پریم چند' کے عنوان سے ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ ثقافتی ادارے رنگ لیلا، ادبی رسالے 'کتھا دیس' اور تیزاب حملوں سے متاثرہ خواتین کی تنظیم 'شیروز' کے مشترکہ اہتمام میں منعقدہ پروگرام میں مقررین نے پریم چند کی ادبی خدمات، ان کی زبان اور عام انسان کے مسائل کو ادب میں پیش کرنے کے حوالے سے خیالات کا اظہار کیا۔سینئر نقاد پروفیسر پریم انکت نے موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں تقریباً ایک دہائی تک اپنی شناخت بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ انھوں نے اپنی پہلی تخلیق اردو میں لکھی، تاہم زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے کے لیے ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا۔انھوں نے دھنپت رائے اور نواب رائے کے نام سے لکھنے کا آغاز کیا تھا، لیکن بعد میں پریم چند کے نام سے شہرت حاصل کی۔انھوں نے کہا کہ پریم چند سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی آمیز اردو کی بجائے ایسی سادہ زبان کے حامی تھے جسے عام ہندو اور مسلمان آسانی سے سمجھ سکیں، اسی لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں سادہ ہندی اور اردو کو ترجیح دی۔معروف ادیب ارون ڈانگ نے کہا کہ پریم چند نے عام انسان کے دکھ درد کو شدت سے محسوس کیا اور اسے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔انھوں نے اردو کی تعلیم مدرسے سے حاصل کی جب کہ ہندی خود مطالعے کے ذریعے سیکھی۔

پروفیسر نسرین بیگم نے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنی تقریباً 56 سالہ زندگی میں عام انسان کے مسائل اور تکالیف کو جس موثر انداز میں ادب میں پیش کیا اسی وجہ سے آج بھی انھیں یاد کیا جاتا ہے۔صدارتی خطاب میں پروفیسر رام ویر سنگھ نے 1936 کے بعد کے پریم چند کے ادب پر روشنی ڈالی اور ان کے مشہور ناول 'گئودان' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں کسان ہوری کی زندگی کے دکھ درد اور معاشی مجبوریوں کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے کہا کہ پریم چند نے ادب میں ایسی مضبوط بنیاد قائم کی جس پر نرالا، ناگارجن اور پھنی شور ناتھ رینو جیسے ادیبوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پریم چند کے ناول 'نرملا' اور ناگارجن کی تصنیف 'نئی پودھ' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب تک ادب زندہ ہے، پریم چند کی اہمیت برقرار رہے گی۔ (انقلاب۔دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں چودھواں منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دہلی (8اکتوبر)۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام شمیم حنفی ہال میں چودھویں منشی نول کشور یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے 'کلاسکی اردو غزل میں جمہوری اور سیکولر اقدار' کے موضوع پر یادگاری خطبہ پیش کیا۔انھوں نے کہا کہ جمہوریت سیکولرزم، اردو اور غزل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو ہندستان کی مختلف قوموں، تہذیبوں اور معاشروں کے باہمی میل جول سے وجود میں آنے والی زبان ہے، اس لیے اس کے مزاج میں رواداری، ہم آہنگی اور کشادہ نظری فطری طور پر شامل ہیں۔صدر شعبۂ اُردو پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ اردو محبت اور دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ موجودہ دور میں اردو کے سیکولر اور جمہوری کردار کو واضح طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ خطبے کے کنوینر پروفیسر ندیم احمد نے نظامت کی۔ڈاکٹر مشیر احمد نے منشی نول کشور کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی، جب کہ ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوتِ کلامِ پاک سے پروگرام کا آغاز اور پروفیسر عمران احمد عندلیب کے اظہارِ تشکر پر اختتام ہوا۔تقریب میں اساتذہ، ریسرچ اسکولرز اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (انقلاب۔دہلی)

ڈاکٹر نریش اُردو ادب میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں 'چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی اعزاز' کے لیے منتخب

نئی دہلی (24اکتوبر)۔ممتاز شاعر، مصنف اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نریش، جو پنجاب یونی ورسٹی میں جدید ادب کے سابق پروفیسر اور چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی (چنڈی گڑھ اکیڈمی آف لیٹرز) کے سابق چیئرمین رہ چکے ہیں، کو چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے اردو ادب میں 2025 کے لائف ٹائم اچیومنٹ اوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ یہ اعزاز اردو ادب کے لیے ڈاکٹر نریش کی چھے دہائیوں پر محیط ان کی ممتاز ادبی خدمات اور علمی سفر کا اعتراف ہے۔ڈاکٹر نریش 7 نومبر 1942 کو پنجاب کے مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے۔انھوں نے اردو اور ہندی میں ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں اور 'جدید ہندی شاعری پر اردو کے اثرات' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ان کا تعلق 1968 میں قائم ہوا، جہاں وہ 1987 تک ہندی کے لکچرر اور ریڈر رہے، اس کے بعد انھوں نے 1988 سے 2004 تک پنجاب یونیورسٹی میں جدید ادب کے پنجابی شاعر 'بھائی ویر سنگھ چیئر' کے پروفیسر اور چیئرمین کے طور پر خدمات انجام دیں۔2005 سے 2008 تک چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین رہے۔ ڈاکٹر نریش کثیر لسانی مصنف، شاعر، نقاد اور مترجم ہیں۔انھوں نے اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ شاعری، افسانوی ادب، ادبی تنقید، فلسفے، روحانیت اور دیگر موضوعات پر ان کی تصانیف کی تعداد 100 سے زیادہ ہے۔ان کی تحریریں متعدد مجموعوں میں بھی شامل ہیں جب کہ ان کے ایک ہزار سے زیادہ مضامین، نظمیں اور مختصر کہانیاں مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔انھوں نے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ادبی مباحث اور ادبی سرگرمیوں میں بھی وسیع پیمانے پر حصہ لیا ہے۔ڈاکٹر نریش کے ادبی سفر میں اردو کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔اس زبان کے لیے کئی دہائیوں کو محیط ان کی خدمات کی متعدد ممتاز ادبی اداروں اور حکومتوں نے پذیرائی کی ہے۔انھیں دیے جانے والے اعزازات میں غالب ایوارڈ، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا آل انڈیا ایوارڈ، حکومتِ پنجاب کا شریومنی ساہتیہ کار ایوارڈ، خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ، لالہ جگت نارائن ایوارڈ، حکومتِ ہریانہ کا باوقار ہریانہ ایوارڈ اور اتر پردیش، مغربی بنگال اور بہار کی اردو اکادمیوں کے اعزازات شامل ہیں۔ان کی کتاب 'لوحِ حیات' کو بھی اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ (قومی میزان۔دہلی)

’سہیل احمد زیدی: تخلیقی جہات اور ادبی خدمات‘ کے عنوان پر سمینار کا انعقاد

لکھنؤ (24 اکتوبر)۔ سہیل احمد زیدی کی غزلوں کا سرمایہ ایسا ہے جس میں کم وبیش وہ تمام صفات یکجا نظر آتی ہیں جو اعلا پایے کی غزل کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ جدید غزل گو کی حیثیت سے شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں اعلا درجے کا غزل گو قرار دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر احمد محفوظ نے ’سہیل احمد زیدی: تخلیقی جہات اور ادبی خدمات‘ کے عنوان سے منعقد یک روزہ قومی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ ادارۂ ادبِ اسلامی ہند (یوپی مشرق) کے زیر اہتمام کیفی اعظمی اکیڈمی میں منعقد اس سمینار کی صدارت شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چیئرمین پروفیسر سراج اجملی نے فرمائی۔ مہمانوں کا استقبال ادارے کے کارگزار صدر عبیدالرحمٰن ازہر نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ حافظ ابو اللیث نے قرآن پاک کی تلاوت فرمائی اور جناب نور الہدیٰ لاری نے کلمات تشکر ادا کیے۔ مہمانوں کی خدمت میں اس موقعے پر یادگاری نشان بھی پیش کیے گئے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ سہیل احمد زیدی کی شعر گوئی کا آغاز نظموں سے ہوا۔ پہلا مجموعہ کلام ’صنوبروں کا شہر‘ سے اس بات کا واضح احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو دنیا اور انسان سے متعلق ان مظاہر سے خصوصی دلچسپی ہے جو زندگی میں مثبت قدر رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی کلاسکی اور جدید شعری روایت کے اثرات زیدی کی غزلوں میں موجِ تہ نشیں کی طرح زیادہ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ سہیل احمد زیدی نے کئی نسلوں کی ادبی تربیت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں ہوش سنبھالنے والی نسل اور پچھلی صدی کی آخری دہائی میں ادبی زندگی کا آغاز کرنے والی نسل کے جن نمائندوں کو سہیل احمد زیدی کی تربیت نصیب ہوئی ان میں عبدالحمید اور احمد محفوظ کے نام بہت اہم ہیں۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جامعۃ الفلاح کے سابق ناظم مولانا محمد طاہر مدنی نے سہیل احمد زیدی کو ایک عہد ساز شخصیت قرار دیا اور کہا کہ ترقی پسند ادبی تحریک کے زمانے میں انھوں نے ادب اسلامی کا علم اٹھایا اور قرآن کی روشنی میں حیات وکائنات کے رموز کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ نثر ونظم دونوں میں زیدی صاحب کمال رکھتے تھے۔ وہ ایک بہترین مزاح نگار بھی تھے۔

سمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر احمد محفوظ کی صدارت میں شروع ہوا، جس کی نظامت اسامہ طیب نے کی۔ اس اجلاس میں سہیل احمد زیدی کی شخصیت اور ان کے فن پر جناب اویس سنبھلی (سہیل احمد زیدی کی نثر نگاری حضور کے حوالے سے)، ڈاکٹر مجتبیٰ حسن صدیقی (سہیل احمد زیدی کی نظم ’بن باس‘ کا تجزیاتی مطالعہ)، جناب فیصل خاں (سہیل احمد زیدی کی نظموں میں اسلامی تلمیحات کا فکری وعصری تناظر)، جناب ایس ایم حسینی (سہیل احمد زیدی کی نثر نگاری: ’صاحبو‘ کے حوالے سے)، جناب ذاکر انور (سہیل احمد زیدی کی شعری جہات)، جناب محمد نسیم فیضی (سہیل احمد زیدی کی نثر نگاری) نے مقالے پڑھے۔

آخری اجلاس میں مشاعرہ ہوا، جس کی صدارت مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے فرمائی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیا۔ مشاعرے میں پروفیسر سراج اجملی، پروفیسر احمد محفوظ، جناب رفعت شیدا صدیقی، ڈاکٹر عمیر منظر، عبیدالرحمٰن ازہر، جناب عبدالسلام گہر بستوی، جناب خیرالبشر بشر، جناب محمد صغیر رحمانی، جناب عبداللہ ثاقب، جناب نازش نہال نے کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر حکیم وسیم احمد اعظمی، پروفیسر ہما یعقوب، پروفیسر ریشما پروین، جناب ہارون رشید، محمد علی زیدی، فراز احمد، سیّد ایاز احمد، سیّد شیراز احمد ڈاکٹر شاہ محمد فائز، راجیو پرکاش ساحر، جناب معاذ احسن، احسن قدوائی، اشعر علیگ، ڈاکٹر احتشام خاں، ڈاکٹر اکبر علی، طاہر جمال، ڈاکٹر شاہد جمال، ڈاکٹر محمد سعید اختر، ڈاکٹر فیض اور جناب امجد سعید وغیرہ شریک تھے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا سعید الرحمن اعظمی

لکھنؤ۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کا 7 اکتوبر 2026 کو 92 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال سے علمی ودینی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی عربی زبان وادب کے ممتاز عالم، ادیب، ناقد اور صحافی تھے۔ وہ طویل عرصے تک تاریخی ادارے دارالعلوم ندوۃ العلما کی بحیثیت مہتمم سربراہی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی انٹیگرل یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے۔ مولانا کی رحلت پر ملک وکرناٹک کے علما سمیت متعدد اہلِ علم خصوصاً مولانا شبیر ندوی نے اظہارِ تعزیت کیا ہے۔

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی پیدائش 14 مئی 1935 کو مئوناتھ بھنجن، اترپردیش میں ہوئی تھی۔ ان کے والد محمد ایوب اعظمی معروف عالمِ دین اور محدث تھے۔ ابتدائی تعلیم مئو کے مدرسہ مفتاح العلوم میں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما سے عربی ادب میں تخصص کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ 1958 میں وہ بغداد گئے، جہاں عربی زبان وادب کے معروف عالم اور ادیب ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی سے تقریباً ایک سال تک استفادہ کیا۔ 1993 سے 1999 تک وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا کے عمید 2000 تا وفات منصبِ اہتمام پر فائز رہے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صحافتی خدمات بھی نمایاں ہیں۔ وہ سیّد محمد الحسنی کے قائم کردہ المنتدی العربی سے وابستہ رہے اور 1955 میں مجلۃ البعث الاسلامی کے اجرا کے وقت اس کی ادارت میں بھی شریک تھے۔ محمد الحسنی کے 1979 میں انتقال کے بعد وہ اس عربی مجلّے کے مدیر اعلا بنائے گئے۔ وہ عربی پندرہ روزہ ’الرائد‘ کے نائب مدیر بھی تھے۔ انھوں نے پچاس سال سے زیادہ عرصے تک دارالعلوم ندوۃ العلما کی مسجد میں امام وخطیب کی ذمے داری بھی ادا کی۔ دعوتی مقاصد کے لیے انھوں نے متعدد ممالک کا سفر کیا۔ وہ عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کے رکن، دینی تعلیمی کونسل کے نائب صدر اور کئی مدارس کے ناظم و سرپرست بھی تھے۔ انھوں نے متعدد معروف اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا، جن میں محمد زکریا کاندھلوی، امین احسن اصلاحی، ابوالحسن علی ندوی، محمد منظور نعمانی اور محمد شفیع عثمانی کی تصانیف شامل ہیں۔ عربی زبان وادب کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے 1994 میں انھیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کا انتقال دارالعلوم ندوۃ العلما اور عربی زبان وادب کے علمی حلقوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

پروفیسر حافظ انیس صدری

سمستی پور۔ للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے سابق صدر شعبۂ اردو، ممتاز علمی وادبی شخصیت اور ملّی و جماعتی خدمات کے لیے معروف پروفیسر حافظ انیس صدری کا 24 اکتوبر 2026 کو علی الصباح تقریباً ساڑھے تین بجے فرید یہ اسپتال، دربھنگہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کی خبر سے علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ نمازِ جنازہ مولانا اشفاق سلفی نے پڑھائی جس کے بعد مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

پروفیسر حافظ انیس صدری نہایت شریف النفس، خلیق، متواضع اور مہمان نواز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سمستی پور میں 20 اکتوبر 1953 میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اعلا تعلیم حاصل کی اور پوسٹ گریجویشن میں گولڈ میڈل حاصل کر کے اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری سے ہوا، بعد ازاں وہ متھلا یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور اپنی علمی و تدریسی صلاحیتوں کی بنیاد پر صدرِ شعبۂ اردو کے منصب تک پہنچے۔ ان کی عمر تقریباً 73 برس تھی۔ پروفیسر انیس صدری گذشتہ کئی مہینوں سے علیل تھے۔ برین ہیمبرج کے بعد انھیں فرید یہ اسپتال دربھنگہ میں داخل کرایا گیا، جہاں دورانِ علاج وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انھوں نے اہلیہ اور تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیوں کے علاوہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھرا پُرا خاندان چھوڑا ہے۔ پروفیسر انیس صدری دینی وملّی اداروں سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ دربھنگہ کی قدیم دینی دانش گاہ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کے اہم محسنین ومعاونین میں شامل تھے اور سلفیہ یونانی میڈیکل کالج کے رکن بھی تھے۔ اس کے علاوہ مدرسہ عزیزیہ رحیم آباد کے صدر اور سابق میں جمعیت اہلِ حدیث، ضلع سمستی پور کے ناظم بھی رہ چکے تھے۔ وہ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے اور جمعیت و جماعت کی تعمیر وترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کے انتقال پر علمی و ادبی حلقوں میں تعزیت کی گئی اور ان کی مغفرت اور بلندیِ درجات کے لیے دعا کی گئی۔

محمد الیاس

نئی دہلی۔ انگریزی روزنامہ ’ٹائمز آف انڈیا‘ کے سینئر فوٹو جرنلسٹ محمد الیاس طویل علالت کے بعد 30 ستمبر 2026 کو بدھ کی صبح 71 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کی خبر سے صحافتی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ پس ماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب ادا کی گئی جس کے بعد دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ اور تدفین میں بڑی تعداد میں صحافیوں، دوست احباب اور دیگر افراد نے شرکت کی۔

محمد الیاس نے دلّی کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پیشۂ فوٹو گرافی کو اپنایا اور اپنی محنت، صلاحیت اور منفرد انداز کے ذریعے صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اعتراف اُس وقت ہوا جب وہ ملک کے معروف انگریزی اخبار ’ٹائمز آف انڈیا‘ سے وابستہ ہوئے اور تقریباً 23 برس تک اس کے سینئر فوٹو جرنلسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

محمد الیاس کا تعلق پرانی دہلی کے ایک معروف خانوادے سے تھا۔ ان کے والد حاجی شبراتی اپنی نہاری کے لیے پرانی دہلی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے محمد الیاس کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ محمد الیاس اور ان کے درمیان ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں نے تقریباً چار دہائی قبل صحافت میں ایک ساتھ قدم رکھا تھا۔ 2014 میں وہ رٹائر ہوگئے تھے۔ معصوم مرادآبادی نے بتایا کہ کئی برس قبل محمد الیاس پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور ان کی حالت اس قدر تشویشناک تھی کہ ان کے صحت یاب ہونے کی امید بہت کم رہ گئی تھی۔ کئی ماہ تک دہلی کے سرگنگا رام اسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد وہ گھر واپس آ گئے، تاہم اس کے بعد ان کا بیرونی دنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہوگیا تھا۔

محمد الیاس کے انتقال پر ان کے صحافتی سفر سے وابستہ ساتھیوں نے انھیں ایک محنتی، باصلاحیت اور اپنے فن سے گہری وابستگی رکھنے والے فوٹو جرنلسٹ کے طور پر یاد کیا۔

ادارہ ’ہماری زبان‘ مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : عشق واجب ہُوا
شاعر : رضوان ساگر
اشاعت : 2026
قیمت : 550 روپے
ناشر : فضلی بک، کراچی
تبصرہ نگار : پروفیسر شاہد کمال

E-mail: shhdkamal@yahoo.com

دُنیاے ادب میں یوں تو ہر تخلیق کار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تخلیقات مجموعے کی شکل میں تزک واحتشام کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوں، لیکن اس معاملے میں ہمیشہ شاعر زیادہ خوش قسمت رہے ہیں کہ ان کی تخلیق دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں مقبولِ عام رہی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ہاں اردو ادب کا مطلب ہی عام سطح پر شاعری لیا جاتا ہے کیوں کہ اس کی رسائی بہر حال عام آدمی تک ہے۔ جہاں تک کتاب چھپنے کا سوال ہے تو زمانے کی ترقی اور بدلتے ہوئے رجحانات نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، وہیں شاعری نے بھی اپنے ابلاغ کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیا ہے۔ آج کے زمانے میں کتاب چھپوانا جتنا آسان اور سستا ہو گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ ڈیجیٹل پرنٹنگ کی سہولت نے ایسے لوگوں کو بھی طباعت کے آسمان پر بٹھا دیا ہے جنھیں کتاب چھپنے سے پہلے اور چھپنے کے بعد بھی اپنے بارے میں یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ صاحبِ کتاب ہیں یا اہل کتاب۔ ایسی صورتِ حال میں اپنی عزت بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قلم کو احتیاط کی حد میں رکھا جائے، لیکن اسی مایوس کن صورت حال میں کبھی کبھی کوئی شاعر خصوصاً نوجوان جب واقعی لمحہ بھر میں اپنے کسی شعر سے یہ ثابت کر دے کہ اُس کا خمیر احساس کی صداقت سے اُٹھا ہے اور اُس کا اظہار ایک محترم روایت کا تسلسل ہے تو مجھ جیسے آدمی کو بھی اس کی گواہی کے لیے قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔

حال ہی میں ایک دیدہ زیب ٹائٹل اور خوب صورت کاغذ سے مزین شاعری کی کتاب 'عشق واجب ہُوا' نظر سے گزری، جس کے تخلیق کار کا نام رضوان ساگر ہے۔ جی چاہا کہ اسے پڑھا جائے۔ مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ تخلیق کار ایک سچا شاعر ہے۔ کتاب کے مطالعے نے مجھے رضوان ساگر کی شاعرانہ لگن اور اس میں موجود جذبوں کی کھنک کو باور کرا دیا، اور میں نے اس کے عشق کی شہادت دینے کا فیصلہ خود پر واجب کر لیا۔ اس کی غزلوں میں موجود وہ لطیف تلازمات ہیں جن میں روایت کی نشانیاں بھی ہیں اور جدت کی کاٹ بھی۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو مجھے شاعر کے تخلیق کردہ ماحول سے لمحہ بھر کو بھی صرفِ نظر نہیں کرنے دیتیں:

بچپن کی ہر ایک کہانی بھول گئے
شہزادے اور ملکہ رانی بھول گئے
لوگ زلیخا کو جو طعنے دیتے تھے
یوسف کی وہ جوانی بھول گئے

ان اشعار میں استعارات اور تلمیحات کی بُنت نے بیان کا جو لطف پیدا کیا ہے اُس کے پس منظر میں صرف مطالعہ یا مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ احساس کی وہ لہر ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے کا وصف رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں دیگر نظم نگاروں کی طرح رضوان ساگر بھی غزل کا پروردہ ہے۔ اسی لیے اس کی نظموں میں بھی غزل کا مزاج جلوہ آرائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہی تلازمات اور وہی اسلوب بیان جو اس کی غزلوں کا ہنر ہے، نظموں کا بھی اختصاص ہے۔

اس کتاب میں موجود 'گھٹن'، 'کھوٹے سکے'، 'عشق نا تمام ہے' اور 'آئینہ' ایسی نظمیں ہیں جو قاری سے خود کو پڑھوانے کا وصف رکھتی ہیں۔ یوں تو کسی کی تخلیقات کے بارے میں کسی بھی طرح کی توصیفی گفتگو کی جا سکتی ہے، اور زمین آسمان کے قلابے ملا کر لمحہ بھر میں اُسے تختِ سلیمانی پر بٹھا کر یہ احساس دلایا جا سکتا ہے کہ آپ جیسا کوئی نہیں، لیکن میرے خیال میں کسی بھی کتاب کی بنیادی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ خود کو پڑھوانے کی طاقت رکھتی ہو اور یہی طاقت رضوان ساگر کے مجموعۂ کلام کی خوبی ہے جو اگر قائم رہی تو انھیں بہت آگے لے جائے گی۔ یوں تو ہر تخلیق کچھ نہ کچھ عیب و ہنر سے آراستہ ہوتی ہے، لیکن ایک ایسے موقعے پر کہ جب کسی تخلیق کار کے فن کا آغاز ہو تو اُسے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ تنقیصی رویوں کے تیر و ترکش کی، لیکن اس موقعے پر کسی بھی حوصلہ شکن تاثرات کا اظہار ایسے ہی ہے جیسے آپ کا کوئی حاسد مہمان آپ کی دعوت میں بہترین کھانا کھانے کے بعد تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہہ کر چلا جائے کہ سب کچھ تو بہت اچھا ہے بس کراکری اگر نیلی ہوتی تو مزہ آ جاتا۔

رضوان ساگر کی کتاب میرے خیال میں ادب میں ایک خوش آئند اضافہ ہے سو ہمیں اس پر خوش بھی ہونا چاہیے اور صاحبِ کتاب کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تخلیق کا سُرور اور لوگوں کی قبولیت یہی وہ دو سہارے ہوتے ہیں جو فن کار کو میدان میں قدم جمائے رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

◆◆◆

نام کتاب : جلال فہمی
مرتب : ڈاکٹر محمد سعید اختر
اشاعت : 2026
ضخامت : 376 صفحات
قیمت : 400 روپے
ناشر : نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج، لکھنؤ
تبصرہ نگار : ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

سید ضامن علی جلال لکھنوی، اُردو ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ شاعر کے علاوہ ماہر لغات تھے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی بے مثال اور لکھنؤ کی نمائندہ شاعری ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں لکھنؤ کے ادبی و مذہبی ماحول کا اثر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے آبائی پیشے طبابت میں بھی مہارت حاصل کی۔ چوں کہ ان کے مزاج میں ابتدا سے ہی شعر و شاعری سے والہانہ شغف تھا، اس لیے جلال لکھنوی نے امیر علی خاں ہلال لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔ انھوں نے روز مرہ کے مسائل، ہجر و وصال کو اپنی شاعری میں خاص جگہ دی۔ جلال لکھنوی نے اپنا تخلص 'جلال' اپنے استاد امیر علی خاں ہلال کے وزن پر رکھا۔ ہلال لکھنوی کے بعد انھوں نے میر اوسط علی رشک لکھنوی، فتح الدولہ برق لکھنوی سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں حکیم مرزا دانش، سید محمد مہدی کمال، محمد شاہ خاں کاوش، میر ذاکر حسین یاس اور سید انوار حسین آرزو لکھنوی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ جلال لکھنوی کی اہم تصانیف میں شاہد شوخ طبع (دیوان اول)، کرشمہ گاہ سخن (دیوان دوم) مضمون ہاے دلکش (دیوان سوم)، نظم نگاریں (دیوان چہارم)، افادۂ تاریخ (موسوم باسم تاریخ)، تحفۂ سخنوران، سرمایۂ زبان اُردو (اُردو لغت)، تنقیح اللغات، دستور الفصحا، گنجینۂ زبان اُردو، منتخب القواعد یا قواعد منتخب، مفید الشعرا، دیوانِ پنجم اور رسالہ عروض وقوافی اہمیت کی حامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'جلال فہمی' میں ڈاکٹر سعید اختر نے جلال لکھنوی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر لکھے گئے مقالات و مضامین کو محنتِ شاقہ سے یکجا اور اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا۔ بابِ اوّل کو 'تذکروں میں محاکمۂ جلال' عنوان دیا گیا جس میں دس مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد سعید اختر نے جن تذکروں میں جلال لکھنوی پر لکھے گئے مضامین کو تلاش کیا، ان میں سراپا سخن، سخن الشعرا، انتخابِ یادگار، بزمِ سخن، طور کلیم، جلوہ خضر، یادگار ضیغم، خم خانۂ جاوید، آب بقا اور گل رعنا اہمیت کے حامل ہیں۔ باب دوم کو 'ادبی مورخین کی نظر میں جلال' عنوان دیا گیا ہے۔ اس باب میں بھی دس مضامین شامل ہیں جو ادبی تاریخوں میں درج تھے۔ ان ادبی تاریخوں میں تاریخِ ادب اُردو، اُردو شاعری کی مختصر تاریخ، تنویر ادب یعنی زبان و ادب اُردو، لکھنؤ کی لسانی خدمات، تعارف تاریخ ادب، مختصر تاریخ ادب اُردو، تاریخ ادب اُردو: عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک، مضامینِ عزیز، تاریخِ ادب اُردو 'جلد چہارم' (حصہ دوم) اور تاریخ ادب اُردو ابتدا سے 2000 تک۔ کتاب کا تیسرا باب 'ادبی محققین اور جلال' عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ اس باب میں جن کتابوں اور رسائل و جرائد میں جلال لکھنوی سے متعلق مضامین شامل تھے ان میں رسالہ ادب، رسالہ ہندوستانی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، جلال لکھنوی: سوانح حیات مع انتخاب کلام، رسالہ آجکل، رسالہ نگار اور لکھنؤ کے چند نامور شعرا کے نام سرفہرست ہیں۔ کتاب کا آخری باب 'دورِ حاضر میں جلال' عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں دورِ حاضر کے اہلِ قلم نے جلال لکھنوی پر جو مضامین لکھے ہیں وہ شاملِ کتاب ہیں۔ ان اہلِ قلم میں پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، مجتبیٰ حسن صدیقی، محمد سعید اختر کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سید ضامن علی جلال لکھنوی کے سالِ پیدائش کی تاریخ میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کے یہاں اختلاف ہے۔ کسی نے 1290ھ مطابق 1831، کسی نے 1244ھ، کسی نے 1250ھ مطابق 1834 لکھی ہے، حالاں کہ ڈاکٹر محمد سعید اختر کے مطابق زیادہ تر محققین نے جلال لکھنوی کی پیدائش 1834 (1250ھ) کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

جلال لکھنوی کی پرورش و پرداخت تو لکھنؤ میں ہوئی لیکن ان کی شہرت کو بامِ عروج عطا کرنے میں ریاست رام پور کا کلیدی کردار رہا ہے۔ 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد جب لکھنؤ اور دہلی کے حالات ناسازگار ہوئے تو زیادہ تر شعرا نے چھوٹی ریاستوں کی جانب اپنا رختِ سفر باندھا۔ جلال لکھنوی نے ان ناسازگار حالات میں اپنے آبائی پیشہ طبابت کو اختیار کیا۔ اس کے بعد وہ والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایما پر رام پور چلے گئے۔ یہاں پہلے سے ہی مرزا داغ دہلوی، امیر مینائی اور امیر اللہ تسلیم جیسے شعرا کا قیام تھا۔ جلال لکھنوی کے رام پور میں قیام کے دوران شعر و شاعری کی محفلوں میں مزید اضافہ ہوا۔ تقریباً 20 سال رام پور میں قیام کرنے کے بعد جلال لکھنوی ریاست منگلور چلے گئے۔ یہاں پر ان کا دل نہ لگا اور واپس لکھنؤ آ گئے۔ جہاں 1909 کو جلال لکھنوی 76 سال کی عمر میں پیوندِ خاک ہوئے۔ جلال کے انتقال پر ان کے صاحب زادے میر مہدی کمال نے قطعۂ تاریخ کہا جو ان کی قبر پر کتبے کی شکل میں درج ہے۔

جلال لکھنوی نے اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے شاعری کی۔ انھوں نے لکھنؤ اور رام پور کے ادبی ماحول اور جاہ و جلال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں دونوں مقامات کے نشیب و فراز کا اثر نمایاں ہے۔ رعایتِ لفظی، روز مرہ محاورات اور عشق و رومان، ہجر و وصال ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی بہتات ہے جن میں رومان کا منہاج شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عشق کی چوٹ کا کچھ دل پہ اثر ہو تو سہی
درد کم ہو یا زیادہ ہو مگر ہو تو سہی

.....

تم رات کو کیا نظر آئے قیامت نظر آئی
سورج نکل آیا مہ کامل کے برابر

.....

نیند نے کیوں وصل کی شب مہربانی کی جلالؔ
آج ہی آنکھوں میں یہ غفلت شعار آنے کو تھی

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے مضمون 'حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی اور ان کی شاعری' میں جلال لکھنوی کی حیات و ادبی خدمات کا محاکمہ تو پیش کیا، ساتھ ہی لکھنؤ کے شعروسخن کی تاریخ بھی بیان کی۔ان کی نظر میں لکھنؤ میں دوطرح کے متضاد قسم کے اسکول قائم تھے جن میں ایک اسکول شیخ آتش کا تھا اور دوسرا ناسخ کا، لیکن جلال لکھنوی نے ان دونوں اسکولوں کے درمیان سے اپنی الگ راہ نکالی۔

پروفیسر محمد حسن نے اپنے مضمون 'معاصرین جلال' میں امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی کا موازنہ پیش کیا۔انھوں نے جلال لکھنوی کی شاعری پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جلال بھی لفظوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔صنعت طباق ان کی محبوب صنعت ہے۔وہ ہر ایک لفظ کے رنگ اور ماہیت سے بہ خوبی واقف ہیں اور جب وہ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے مخاطب لفظ اور اس سلسلے کے دوسرے الفاظ استعمال کی پوری تصویر بنا لیتے ہیں۔

پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے مضمون 'حکیم سید علی ضامن' میں ان کی شعری ونثری تصانیف کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔انھوں نے اس باکمال کلاسکی شاعر کے تحقیق، تاریخ گوئی وزبان دانی کے سرمایے کو نظر انداز کرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔انھوں نے جلال لکھنوی کی تالیف 'سرمایۂ زبانِ اُردو' (طبع 87-1886) پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں تالیف ہوئی۔ہم جانتے ہیں کہ اس نوع کی زیادہ بڑی اور مبسوط لغت 'فرہنگِ آصفیہ' سیّد احمد دہلوی نے 1900 میں تالیف کی۔

بہرکیف! ڈاکٹر محمد سعید اختر نے اپنی محنت، لگن، تلاش وجستجو سے جلال لکھنوی پر لکھے گئے اہلِ قلم کے اہم مضامین کتابی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیے ہیں۔واضح رہے کہ ڈاکٹر موصوف نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس سے ڈاکٹر عمیر منظر کی زیرنگرانی 'جلال لکھنوی کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ' عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے، اس لیے سعید صاحب کی نظر جلال لکھنوی کے ادبی سرمایے پر زیادہ ہے۔کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر عمیر منظر نے لکھا ہے جب کہ پشت پر محمد اویس سنبھلی نے اپنی رائے پیش کی ہے۔راقم ڈاکٹر موصوف کو اس اہم کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ موصوف رسائل وجرائد میں جلال لکھنوی کے تعلق سے لکھے گئے دیگر مضامین کو بھی جلد ہی منظرِ عام پر لانے کے لیے سرگرم ہوں گے۔ ◆◆

دیوانہ ہے تمھارا کوئی غیر نہیں ہے
روٹھا ہے تو سینے سے لگا کیوں نہیں لیتے
آپ کو کون 'تم' پکارے گا
آپ کس کو کہا کریں گی 'آپ'

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

ان کے اشعار ایک عجیب قسم کی دردمندی، اضمحلال اور کرب کی نشان دہی کرتے ہیں اور فرد کے باطن میں گھس کر اس کی اندرونی کیفیات کو آشکار کرتے ہیں۔زندگی کا دکھ اور جدائی کے کرب سے شاعر کے نازک آبگینے کو ٹھیس لگ جاتی ہے تو ایسے غم انگیز شعر صفحۂ قرطاس پر اتر آتے ہیں:

اب تم کبھی نہ آؤ گے یعنی کبھی نہیں
رخصت کرو مجھے کوئی وعدہ کیے بغیر

ان کے داخل میں پنہاں کشمکش ان کے شعروں سے نمودار ہوتی ہے۔شدتِ غم، یاس وحرماں، تنہائی ومحرومی ایسے محرکات ہیں جو اعلا درجے کی شاعری وجود میں لانے کا ہنر جون ایلیا میں پیدا کرتے ہیں۔جون کی زندگی عجیب طرح کی الجھنوں اور پریشانیوں سے دوچار رہی۔خوشی غم اور دھوپ چھاؤں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے اسلوب میں ایک خاص طرح کی سنجیدگی اور متانت اُمڈ آئی۔پھر کیا تھا۔شدید کرب واذیت گھٹن، سسکتی زندگی کا شدید احساس ان کی شاعری سے ظاہر ہونے لگا۔اس طرح کہ:

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

شگفتگی کی تری یاد جو دلاتے ہیں
میں ایسے سارے ہی پودے اکھاڑ ڈالوں گا

کہتے ہیں کہ جون ایلیا نے جیتے جی اپنی شاعری کی کوئی کتاب شائع نہیں کی۔خود ان کا کہنا تھا: ''اپنی شاعری کا جتنا منکر میں تھا اتنا منکر میرا کوئی بدترین دشمن بھی نہیں ہوگا۔کبھی کبھی تو مجھے اپنی شاعری بڑی بے تکی لگتی ہے۔اس لیے اب تک میرا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اور جب تک خدا ہی شائع نہیں کرائے گا اس وقت تک شائع ہوگا بھی نہیں''۔

ان کی وفات کے بعد ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے، ان میں شاید (1992)، گمان (2006)، گویا (2010)، لیکن (2010)، یعنی (2014) اور رموز (2016) قابلِ ذکر ہیں۔

جون ایلیا کی شاعری اردو کے علاوہ ہندی اور رومن زبانوں میں بھی دستیاب ہے۔

جون ایلیا نے 8 نومبر 2002 کو کراچی پاکستان میں وفات پائی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

شیموگہ، کرناٹک
Mob. No.: 8296694020
E-mail: sirajzebayi10@gmail.com

محرابِ تمنا
فطرت انصاری
قیمت: 200 روپے

جون ایلیا عالمی شعروادب کا ایک معتبر نام

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

احساس میں شامل کرنے کی کوشش کی تاکہ سنجیدہ قارئین کے ذہنوں میں ان کی شاعری پڑھ کر خوش گوار تاثرات نقش ہوں۔اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں آپ نے کیا نہیں کیا

شہرتِ عام کی تمناؤ
اس کی خدمت میں آ کے بس جاؤ

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم ان سے جلتے ہیں

جون ایلیا کا قلم زندگی کے تلخ حقائق کو بے باکی سے بیان کرنے پر پوری طرح قادر تھا۔ان کے کئی اشعار تو ایسے ہیں جن میں جون نے اپنا پورا لہو نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔یہ اشعار دیکھیں:

دشمنو تم کو خوف کس کا ہے
مار ڈالو کہ میں اکیلا ہوں

کیا کہا آج جنم دن ہے مرا
جون تو یار مر گیا کب کا

ناخن کی طرح پھینک دیا مجھ کو تراش کر
شاید میں اپنی حد سے بھی آگے نکل گیا

حاصل کن ہے یہ جہانِ خراب
یہ ہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

جون ایلیا شاعری میں سادگی و پرکاری ہی کی بدولت فکری تجربوں کے ماحول میں اپنی 'جون' میں رہتے تھے۔وہ شاعری میں ہمیشہ اپنے ظاہر و باطن کو صاف صاف بیان کرنے کے حق میں تھے۔یہ حقیقت ہے کہ جون ایلیا مشاعرے کے اسٹیج پر اپنے شعری پرفارمنس کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول تھے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ جون ایلیا کی شاعری ہمیشہ قاری کو ساتھ لے کے چلتی ہے۔یہ اس لیے کہ وہ ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر شاعری کرتے تھے۔جون ایلیا قطعی طور پر مشاعروں کے حوالے سے ہی مقبول تھے۔شعرا اچھے ہوں تو وہ اپنا مقام خود بنا لیتے ہیں۔چاہے وہ مشاعروں کے ذریعے سے آئیں یا رسالوں کے راستے سے۔

آیئے جون کے چند شعروں کا حظّ اٹھاتے چلیں:

نظر انداز کرتے ہو شدت سے
تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے

تم اپنی انتہا تو بتا دیتے
خود کو اور گرا دیتا میں

بن تمھارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمھاری ہے

جانے مجھ سے یہ کون کہتا ہے
آپ اپنا خیال تو رکھیے

اور پھر اس شعر میں جمالیات کی شدت دیکھیں:

کسی لباس کی خوشبو جب اڑ کے آتی ہے
ترے بدن کی جدائی بہت ستاتی ہے

محبت انسانیت کا حسن اور روح کی پاکیزگی ہے۔محبت وہ پھول ہے جس کی خوشبو تمام عالم کو معطر کر سکتی ہے۔محبت، عشق اور عاشقی کی باتیں تو اپنی شاعری میں موصوف نے خوب کی ہیں۔کہتے ہیں:

جون ایلیا عالمی شعروادب کا ایک معتبر نام

سراج زیبائی

اُردو غزل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے عالمی شہرت یافتہ شاعر جون ایلیا جیسا البیلا شاعر ملا جس نے اپنی عمدہ شاعری کی بدولت ایسی شہرت اور نیک نامی حاصل کی جو کم شاعروں کے نصیب میں آتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے روحانی کرب اور خوشی کا اظہار بننے کے عمل میں کئی مرحلوں سے گذرتی ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں دل آویز اور نکھرا ہوا رنگ نظر آتا ہے۔ چوں کہ جون کو تغزل کے تمام آداب سے واقفیت تھی۔ ان کے شعروں میں جہاں حسن وعشق کی جلوہ سامانیاں ہوتی ہیں وہیں بادۂ تصوف کی سرمستیاں، عرضی حقائق، کائنات اور ماورائے کائنات کے مسائل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اپنی شاعری کو انھوں نے اپنے خوب صورت جذبات واحساسات سے مزین کر کے ایک نئی سمت عطا کی ہے۔ انھوں نے کبھی فرسودہ خیالات کو اپنی شاعری کا حصہ نہیں بنایا، نہ ہی کبھی سنگلاخ زمینوں کا استعمال کیا۔ بالکل صاف اور شیریں الفاظ میں انھوں نے اپنے خیالات کو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔ ہمیشہ ایک عجیب مخمصے میں رہنے والے جون ایلیا کے اشعار میں ہمیں بے بسی، مایوسی اور محرومی کا پرتو نظر آتا ہے۔

جون ایلیا کی پیدائش 14 دسمبر 1931 کو امروہہ کے ایک علم پرور گھرانے میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سید سبط اصغر نقوی تھا۔ جون ایلیا کے قلمی نام سے پوری اردو دنیا میں معروف ومقبول ہوئے۔ ایک صاحبِ طرز شاعر ہونے کے ساتھ ایک نامی گرامی محقق، فلاسفر اور ایک بہترین اسکولر کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ جون ایلیا معروف شاعر رئیس امروہی کے برادر عزیز تھے۔ اردو زبان کے علاوہ انگریزی، فارسی، سنسکرت وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ پیدائش تو امروہہ میں ہوئی لیکن انھوں نے پاکستان میں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ محض آٹھ سال کی عمر میں ان کو شعر وشاعری سے شغف پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر ہی سے اردو دنیا میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی تھی۔ رسالوں سے زیادہ مشاعروں کے حوالے سے ان کا نام مقبول ہوا۔ یہ اس لیے کہ ان کی شاعری ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہو چکی تھی۔ اپنے تجربے اور جذبے کو راست بنا کر موصوف اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے۔ سلیس لفظیات کو فکری آرائش سے شعری پیراہن عطا کرنا ان کی بنیادی خصوصیت تھی۔ اپنی مسحور کن شاعری سے سامعین کو مبہوت وششدر کرنے کا فن جون ایلیا کو قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

عمر گزرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا

رکھو دیر وحرم کو اب مقفل
کئی پاگل یہاں سے بھاگ نکلے

ہے کچھ ایسا کہ جیسے یہ سب کچھ
اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے کہیں

تو مجھے ڈھونڈ میں تجھے ڈھونڈوں
کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے

جون ایلیا کے اکثر اشعار کو ہم ایک اچھی شاعری کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں کیوں کہ ان شعروں میں وہ سارے لوازمات موجود ہیں جو ایک اچھی شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی شاعری میں لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ ہیجانی کیفیت اور جذباتی برانگیختگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ شعر بظاہر تو سیدھے سادے اور سلیس ہوتے ہیں، لیکن وہ بالکل تازہ اور نئے ہونے کا احساس دلاتے ہیں:

اب تری آرزو کہاں مجھ کو
میں تری بات بھی نہیں کرتا

مدت ہوئی کہ آپ نے دیکھا نہیں کہیں
مدت کے بعد آپ سے دیکھا نہ جائے گا

یہ بھی ممکن ہے میاں آنکھ بھگونے لگ جاؤں
وہ کہیں 'کیسے ہو تم' اور میں رونے لگ جاؤں

میں تمھیں بھول بھی تو سکتا تھا
ہاں مگر یہ نہیں ہوا مجھ سے

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
بڑی رونق لگائے رکھتا تھا

اب کوئی مجھ کو دلائے نہ محبت کا یقیں
جو مجھے بھول نہ سکتے تھے وہی بھول گئے

قدرت کی عطا کردہ ذہانت اور عصری حسیت کے اشتراک سے جون صاحب کا لہجہ نمودار ہوتا ہے، اور اسی منفرد لہجے، پیکر آفرینی اور معنوی تہ داری سے ان کی صحیح شناخت ہوتی ہے۔ ان کی تقریباً پوری شاعری کے موضوعات عشق ومحبت اور ہجر ووصال سے لبریز ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے محبوب سے بچھڑنے کی کیا انوکھی کیفیت بیان کی ہے:

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا
تو کیا سچ مچ جدائی مجھ سے کر لی
تو خود اپنے کو آدھا کر لیا کیا

کہتے ہیں کہ جون رند بلانوش تھے۔ اس کا اعتراف انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

تم نے بہت شراب پی اس کا سبھی کو دکھ ہے جون
اور جو دکھ ہے وہ یہ ہے تم کو شراب پی گئی

معروف کالم نگار زاہدہ حنا سے ان کی شادی ہوئی تھی، لیکن بعد میں طلاق بھی ہوگئی۔ ان کی تقریباً پوری شاعری میں اپنی بیگم سے جدائی کا غم ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

اب تری آرزو کہاں مجھ کو
میں تری بات بھی نہیں کرتا

ترے بغیر مجھے چین کیسے پڑتا ہے
مرے بغیر تجھے نیند کیسے آتی ہے

اور اس شعر میں شاعر کی جھنجھلاہٹ دیکھیں کس شدت کی ہے:

اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

ان کی شاعری میں قربتوں کا زوال اور وابستگیوں کی بے معنویت مختلف زاویوں سے نظر آتی ہے۔ جون ایلیا شاعری کی بنیادی خوبیوں سے واقف تھے۔ ان کی شاعری میں موجودہ عہد کی بے حسی بڑی شدت کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ انھوں نے کھلی آنکھوں سے حیات وکائنات کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور انسانی ضمیر کی آواز اپنے

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***